ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری

راشد کی شخصیت کے مذہبی رنگ

The 'Trend Setter' Urdu Poet of the twentieth century, N. M. Rashed has been considered as an 'Non-believer' and a 'Denier' for his modernism and liberalism. This concept was strengthened by the event of his cremation which was considered as the fulfillment of his WILL, though no such WILL is proved. As far as the matters and practices of his life are concerned, they include a number of folds that reflect the religiosity in his personality. Under their light, it would be wrong to consider him as a 'Non-believer' or a 'Denier'. Though he was not a staunch Muslim yet, he was an average Muslim. So his life displayed all the dogmatic leanings as was the trait of other Muslims.

اندیشہ ہے کہ اس عنوان کو ''اجتماعِ ضدّین'' پر محمول نہ کر لیا جائے کیونکہ ن۔م۔راشد کے شخصی رجحانات ومیلانات کے بارے میں ہم میں سے بہتوں کی معلومات محض مفروضوں اور غیر مستند روایتوں پر مبنی ہیں اور ان کی مدد سے بنائی گئی ''رائے'' سے رجوع کرنے میں ہمارا عمومی مزاج حائل رہتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم کفر والحاد کے فتوے صادر کرنے سے ذرا بھی نہیں چوکتے اور اس ضمن میں تحقیق کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے علاوہ مذہبی اخلاقیات کو بھی بالکل پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ راشد کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ لیکن جب ہم ان کے شخصی رجحانات ومیلانات کا جائزہ لیتے ہوئے حقائق کی بازیافت کرتے ہیں تو ان کی شخصیت میں موجود مذہبی رنگ بھی ہویدا ہونے لگتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کا ایک پہلو افقی ہے تو دوسرا عمودی۔ افقی سطح پر انسان روشناسِ خلق ہو کر زندہ رہتا ہے اور اس کی مادی وطبیعیاتی زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس عمودی سطح کا تعلق انسان کے عقیدہ ومذہب اور روحانی و مابعد الطبیعیاتی فکر وعمل سے ہے۔ راشد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ انھیں ملحد اور لامذہب گردانا تو گیا ہے، مگر وہ ہیں نہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کی بعض نظموں میں ''خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے'' کے ایسے مصرعے موجود ہیں جو کفر والحاد کا اشارہ محسوس ہوتے ہیں اور مذہب پسند ذہنوں میں کھٹکتے ہیں اور پھر رہی سہی کسر راشد کی میت سوزی کے واقعے نے نکال دی اور اسے تصدیق کیے بغیر ان کی وصیّت کی تعمیل سمجھتے ہوئے انھیں کافر وملحد قرار دے دیا گیا۔ وہ مرنے کے بعد ''مرحوم'' کے بجائے ''آنجہانی'' کہلائے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کے فتوے صادر کرتے ہوئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ مذہب تو ایک ایسا احساس ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے دائرے سے خود نکل بھی جائے تو وہ اس کے احاطۂ خیال سے باہر نہیں نکلتا اور پھر منطقی ذہنوں میں پائی جانے والی تشکیک اور کشمکش کو کفر والحاد سے تعبیر کرنا بھی ضروری نہیں کہ ہر حال میں درست ہی ہو۔ راشد کی شخصیت کے اس نازک اور متنازعہ پہلو پر قلم آزمائی کرتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ مزید یہ کہ زندگی کے کسی ایک مرحلے یا واقعے کا اطلاق پوری زندگی پر کرنے کے بجائے ارتقائی سفر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس

Scanned by CamScanner

کے بغیر حق وانصاف کے تقاضے پورے نہیں کیے جاسکتے۔

۱۹۶۹ء میں جب راشد نے لندن میں ہرنیا اور غدۂ قدامیہ (Prostate Gland) کے اپریشن کروائے تو احباب عیادت کے لیے گئے۔ان میں ساقی فاروقی بھی تھے۔وہ ''حسن کوزہ گر'' میں لکھتے ہیں:

''پوچھا گیا طبیعت کیسی ہے؟ کہنے لگے ''اس نیلی چھتری والے کا کرم ہے''۔کسی نے چھیڑا۔''نیلی چھتری والا کون؟'' ہنس پڑے۔''نہیں بھائی نہیں۔اس کا کرم ہے۔'' یہ واحد واقعہ ہے کہ انھوں نے خدا کا اتنی خاطر جمعی سے اقرار کیا۔شاید زندگی کی طرف دوبارہ واپسی پر وہ اپنا کفارہ ادا کر رہے تھے۔اگر ایسا تھا تو اس کفارے کی میعاد بہت مختصر تھی،پھر زندگی کی ہماہمی میں نہ انھیں خدا کی ضرورت پڑی،نہ انھوں نے خدا کو یاد کیا۔یوں بھی کسی منطقی دماغ میں خدا کے لیے گنجائش کم ہوتی ہے۔'' (۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی تکلیف کی حالت میں بھولے ہوئے عقاید کا یاد آنا اور مذہب کی آغوش میں پناہ لینے کی سعی کرنا انسان کی نفسیاتی ضرورت ہے۔اسے ہم بشری کمزوری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔بیماری کے عالم میں خدا کے اتنی خاطر جمعی سے اقرار کے پیچھے راشد کی بھی نفسیاتی ضرورت کارفرما ہو سکتی ہے۔تاہم اس سے اتنا تو بہرحال ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ خدا سے بے نیاز اور اس کی قوتوں کے منکر نہیں تھے۔یہ بات تو کچھ زائد معلوم ہوتی ہے کہ ''پھر زندگی کی ہماہمی میں نہ انھیں خدا کی ضرورت پڑی نہ انھوں نے خدا کو یاد کیا''۔خدا کو یاد کرنے کے لیے دوستوں کو بتانا یا اعلان کرنا تو ضروری نہیں ہوتا۔رہی یہ بات کہ کسی منطقی دماغ میں خدا کے لیے گنجائش کم ہوتی ہے،درست بھی ہو تو اس سے خدا کی نفی تو لازم نہیں آتی اور پھر یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ راشد کا دماغ کس قدر منطقی اور کس حد تک غیر منطقی تھا۔ساقی فاروقی کے متذکرہ بیان پر راشد کے داماد فاروق حسن نے اپنے مضمون "Beyond Blasphemy and Prayers: The Concept of God in Rashid's Poetry" کی عمارت استوار کی ہے اور راشد کی شاعری کے حوالے سے ان کے تصورِ خدا کو سمجھنے سمجھانے کی سعی کرتے ہوئے فاروقی کے بیان کا کسی قدر احتساب بھی کیا ہے۔ (۲)

یہاں ہم راشد کی شاعری سے بحث نہیں کر رہے ہیں،لہٰذا اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔البتہ اس موقع پر راشد کے ایک خط کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۲۲ پریل ۱۹۷۳ء کو اپنے دیرینہ دوست ابنِ حزیں کے نام رقم کیا تھا۔اس خط کے مندرجات کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ عمر کی آخری ساعتوں میں راشد کے بطون میں خوابیدہ مسلمان جاگ اٹھتا ہے اور وہ کسی غیبی قوت کی عنایات کو شمار میں لاتے ہوئے خدا کا ہزار ہزار شکر بجا لاتے ہیں۔رقمطراز ہیں:

''.....کوئی خفیہ ہاتھ میرے سر پر ضرور موجود ہے جو مجھے حد سے زیادہ مصائب سے بچاتا رہتا ہے۔اکثر زندگی کے سانحوں کا شمار کرتا رہتا ہوں جن میں کار کے تین چار حادثے،ڈاکو کا حملہ،ڈوبتے ڈوبتے بچ جانے کے تین واقعات وغیرہ شامل ہیں،تو خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔پھر جیسے ایک دوست کہا کرتے ہیں،خدا ''حلال'' تو سب کو دیتا ہے،جس کو ''حرام'' کی توفیق دے،اس پر اس کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔اس لحاظ سے بھی اس کی خاص عنایات کا اہل رہا ہوں۔جہاں تک روزگار کا تعلق ہے،کبھی بھول نہیں سکتا کہ ۳۲ روپے کی ملازمت ایم۔اے کرنے کے بعد بمشکل ملی تھی (جس سے میں نے تمھیں بچا لیا تھا)،اور اب جب کہ ریٹائر ہونے میں چھ ہفتے سے کم وقت رہ گیا ہے،اپنے کئی حریفوں سے بہتر حالت میں ہوں۔اس کے علاوہ ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ زندگی بھر دشمن ساتھ لگے رہے ہیں لیکن جب بھی کسی نے دشمنی حد سے بڑھ کر کی ہے،خود اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور نیازمند کو خدا نے ہر قسم کی ذلت اور رسوائی سے صاف بچا لیا ہے۔خدا کا بار بار شکر ادا کرتا ہوں۔'' (۳)

Scanned by CamScanner

ہو سکتا ہے کہ راشد کی مذہبی حس اپنی عیسائی بیوی کے سامنے کسی نفسیاتی ردِ عمل کے نتیجے میں کچھ زیادہ ہی بیدار ہو جاتی ہو مگر یوں بھی ہو تو کیا مضائقہ ہے؟ اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ ان کا باطن مذہب سے یکسر خالی نہیں تھا اور ان کے دل کی تجوری میں مذہب کا وہ خزانہ عمر کے آخری حصے میں بھی کسی نہ کسی حد تک محفوظ تھا جو انھیں ورثے میں ملا تھا۔

راشد کے خطوط، ان کے اعزہ و اقربا کے مصاحبوں اور دیگر مستند تحقیقی مصادر کے مطابق راشد کے والدین، نانا نانی، دادا دادی، سبھی بہت متدین اور متشرع حنفی العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کا خاندان کئی پشتوں سے خدمتِ دین اور تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دے رہا تھا اور اسی حوالے سے شہرت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ راشد اپنے خاندانی فیضان سے محروم نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کا بچپن اور لڑکپن زیادہ تر دادا دادی کے زیرِ سایہ گزرا۔ یہاں راشد نے شروع ہی سے صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور دیگر مذہبی رسوم کی ادائیگی کے رجحان کا غلبہ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ ان کا بچپن بھی اسی رجحان کی تقلید و اتباع میں گزرا۔ دادی کسی قدر توہم پرست اور خوابوں پر یقین رکھنے والی خاتون تھیں۔ راشد نے ان سے بھی اثرات قبول کیے۔ جہاں تک دادا کا تعلق ہے، وہ دیندار شخص تو تھے مگر قرآن حکیم کی تعبیر و تفسیر اور تشریح و تاویل کے معاملے میں روشن فکر، منطقی اور تعقل پسند تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہیں سے عمل اور ردِ عمل دونوں صورتوں میں راشد کے قلب و دماغ میں مذہب سے متعلق ایک کشمکش پیدا ہو گئی جو کسی نہ کسی صورت میں تمام عمر ان کے ساتھ رہی۔ اس کشمکش میں اضافہ جدید تعلیم اور سمندر پار قیام سے ہوا۔ اسی طرح ان کی زندگی میں متضاد اثرات ڈالنے والی بعض شخصیات بھی آئیں جو راشد کے لیے بیک وقت مخالف سمتوں میں کشش رکھتی تھیں۔ چنانچہ حکیم فرزانہ غالب کے لفظوں میں کچھ ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

مگر اس کشمکش کے ہوتے ہوئے بھی راشد کی زندگی میں بعض ایسے ادوار ضرور آئے جب ان پر مذہب کا شدید غلبہ رہا۔ جوانی کے چند برسوں میں خدمتِ اسلام کے جذبے میں بے پناہ شدت دکھائی دیتی ہے۔ یہ شدت م۔ حسن۔ لطیفی کے نام لکھے گئے بعض خطوط میں بڑی واضح صورت میں آئی ہے۔ ۷ فروری ۱۹۳۰ء کو ملتان سے انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ابھی ابھی ڈاک میں تمھاری وہ نظم ملی ہے جس میں تم نے جواہر لال نہرو کو دعوتِ اسلام دی ہے۔ میں نے اس نظم کو کم و بیش پانچ دفعہ پڑھا ہے، میرے دل میں جذبات کا ایک وسیع سمندر موجزن ہو گیا ہے اور اسلام کی راہ میں اپنی زندگی قربان کرنے کی ہوس از حد بے تاب کر رہی ہے۔ ''صبح فرغانہ سے تا غربت شام رنگوں'' پر میں نے وہ آنسو بہائے ہیں جو کبھی نہ بہائے تھے۔ کس قدر زبردست نظم لکھ گئے ہو لطیفی۔ تنقید کے تمام اصول سے بے نیاز، سب سے بلند! میرے خیال میں اس ایک نظم پر وہ تمام ادبی آثار قربان کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے انقلاب فرانس کی پیش روی کی تھی۔ میں آج کل اسلامیات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اسی نقطۂ نظر سے کہ شاید کسی دن میں اسلام کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے قابل ہو جاؤں۔ میں اس نظم کے مطالعہ کے بعد اپنے جسم و روح میں ایک ایسی توانائی بلکہ ایسی تندی اور درشتی محسوس کرتا ہوں جو پہاڑ چیر جانے پر بھی مطمئن نہ ہوگی۔ میرے خیال میں خدا نے یقیناً تمھیں ایک ایسی قوت عطا کی ہے جو نہ صرف خود تمھیں آفات کفر و الحاد کو فنا کرنے کے قابل بنا دے گی بلکہ ان سب لوگوں کو جنھوں نے صدقِ دل سے تمھارے مطالب کو سمجھا ہے اور اس سے متاثر ہوئے ہیں، جذبۂ عمل سے سرشار کر دے گی۔ میری دعا ہے کہ جس مشعل کو لے کر تم اٹھے ہوئے ہو وہ ہماری پسماندہ قوم اور ہمارے سیہ بخت وطن کے لیے ایک سیلاب نور ثابت ہو۔'' (۲)

لطیفی کے نام راشد کا ایک اور خط بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں انھوں نے حج بیت اللہ اور زیارتِ روضۂ رسول

ﷺ کے بارے میں عقیدت مندانہ پرخلوص جذبات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کے لیے اپنے دل میں موجزن درد کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ یہ خط انھوں نے ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ملتان سے لکھا۔ رقم طراز ہیں:

> "یہ سن کر بہت خوش ہوا ہوں کہ آپ دیارِ حبیب ﷺ کی طرف عازم سفر ہو رہے ہیں۔ میرے نزدیک حج کی سب سے بڑی قیمت یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آخری خواب گاہ کی زیارت کی جائے۔ کاش میں بھی جلد تر اس قابل ہو سکوں۔ یہ بات اور زیادہ مسرت آگیں ہے کہ امسال مکہ معظمہ میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ آپ اس میں ضرور شرکت کیجیے اور اگر موقع ملے تو فارسی یا عربی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالت پر تقاریر بھی کیجیے۔ اگر ایسی تقاریر آپ کو کرنا مدِنظر ہو تو ابھی سے ان کی ترتیب و تدوین کرنا مفید ہوگا اور پھر اس کانفرنس کے متعلق اپنے تاثرات کہیں درج کر لیجیے تا کہ ہندوستانی اخباروں میں شائع ہو سکیں   حج کے لیے کب تک روانہ ہو جائیے گا؟ جائیں تو میرا بھی سلام لیتے جائیں، خدا آپ کو یہ سعادت جلد نصیب کرے۔" (۷)

اس خط کے مندرجات میں اور باتوں کے علاوہ مسلمانوں اور خصوصاً حنفی العقیدہ مسلمانوں کی نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ والہانہ شیفتگی اور گہری محبت و عقیدت کا اشارہ بھی ملتا ہے، جس کے نتیجے میں علامہ اقبال کی زبان سے "دیں ہمہ اوست" کے الفاظ ادا ہوئے تھے اور جسے "با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار" کی روح بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یوں تو راشد کے احاطۂ خیال سے "خدا" کی جلاوطنی کی نوبت، ان کی ہر طرح کی آزاد خیالی کے باوجود نہ آسکی۔ وہ خدا سے گلہ مند و شکوہ سنج بھی رہے اور تشکیک و کشمکش میں مبتلا بھی مگر خدا کو بھلا نہ سکے۔ چنانچہ ان کے اکثر و بیشتر مکاتیب میں، خواہ ان کا تعلق عمر کے کسی بھی حصے سے ہو، خدا کے رحم و کرم اور نصرت و حمایت کے حوالے سے دعائیہ کلمات مندرج دکھائی دیتے ہیں۔ لڑکپن میں تو انھوں نے حمد نگاری بھی کی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی بعض تحریروں خصوصاً نظموں میں خدا کے ساتھ "دیوانگی" برتنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر جہاں تک نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کا تعلق ہے، اس کے بارے میں راشد نے کبھی غیر محتاط رویہ اختیار نہیں کیا۔ راقم کی نظر سے ان کے جتنے بھی غیر مطبوعہ خطوط گزرے ہیں، ان میں شاذ ہی ایسا ہوا ہوگا کہ انھوں نے اسم محمد ﷺ لکھا ہو اور اس پر درود و سلام کے لیے مخصوص علامت "ؐ" نہ درج کی ہو۔ مخصوص مذہبی ماحول میں رہتے ہوئے لڑکپن میں تو راشد نعت گوئی اور نعت خوانی بھی کیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ صورت نہ رہی لیکن حضور ﷺ کے احترام و عقیدت میں کمی واقع نہ ہوئی۔ اس ضمن میں راشد کی ایک نظم "بے چارگی" کا حوالہ دیے بغیر چارہ نہیں، جو انھوں نے نیویارک، امریکہ میں ۱۶ دسمبر ۱۹۵۳ء کو لکھی۔ (۸) اگرچہ یہ نظم، شاید ان کی شاعری کے عمومی مزاج سے دور ہونے کی بنا پر کسی مجموعے کا حصہ نہ بن سکی مگر راشد کی شخصیت کے زیرِ بحث پہلو کو سمجھنے میں معاون ہے۔ اس میں راشد نے متعدد کافروں، ملحدوں اور شرعی روایتوں کے باغیوں کو جہنم میں دکھایا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ بے چارگی کا شکار "غلام احمد" کو دکھایا گیا ہے، جس نے عقیدۂ ختم نبوت پر براہِ راست ضرب لگائی تھی:

مگر میرے خدا، میرے محمدؐ کے خدا مجھ سے
غلام احمد کی برفانی نگاہوں کی
یہ دلسوزی سے محرومی
یہ بے نوری یہ سنگینی
بس اب دیکھی نہیں جاتی
غلام احمد کی یہ نامردی دیکھی نہیں جاتی......

Scanned by CamScanner

گذشتہ صفحات میں ہم نے م۔ حسن۔ لطیفی کے نام راشد کے دو خطوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کی یادگار ہیں جب ان کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔ اس زمانے میں راشد پر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا جذبہ غالب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مزید دو سال کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء کے اواخر میں خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور اس کے فروغ کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اس زمانے میں راشد صوم وصلوٰۃ اور دیگر مذہبی رسوم کے بھی پابند تھے۔ یہ سلسلہ کم وبیش ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد راشد اس تحریک سے وابستہ نہ رہے اور ریڈیو، فوج اور اقوام متحدہ کی ملازمتوں نے انھیں کچھ ایسا ماحول دیا کہ وہ "باعمل یا عملی مسلمان" نہ رہ سکے۔ بہر حال جیسا کہ مندرجہ بالا مباحث سے ظاہر ہے، عقیدہ و مذہب کی حد تک انھیں کافر ملحد قرار دینا انتہائی مشکل ہے۔ صوم وصلوٰۃ سے دور ہو جانے کے باوجود راشد بہت عرصے تک خاص مواقع سے متعلق روایتی طور طریقوں کو نبھاتے رہے۔ مثلاً راشد کے بہنوئی پروفیسر غلام محی الدین مرزا کے بیان کے مطابق ۱۹۶۱ء میں پہلی بیوی کے انتقال کے موقع پر راشد نے کراچی میں "قل" اور "چہلم" کا اہتمام کیا اور خود بھی قرآن خوانی کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی روایات سے انحراف کرنے اور راہ فرار اختیار کرنے میں بے حد دشواری ہوتی ہے۔ راشد جیسے آزاد خیال انسان کے لیے بھی ایسا کرنا آسان نہ تھا۔

راشد کا خاندان تصوف کے سلسلۂ چشتیہ سے فیض یاب تھا اور بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے بطور خاص ارادت و عقیدت رکھتا تھا۔ راشد کو یہ ارادت وعقیدت ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد فضل الٰہی چشتی تو سلسلۂ چشتیہ میں باقاعدہ بیعت بھی رکھتے تھے اور بالالتزام چشتی کہلاتے تھے۔ راشد جیسے "منطقی ذہن کے انسان" کے لیے بھی ان وراثتی اثرات سے بچ نکلنا محال ثابت ہوا۔ پروفیسر غلام محی الدین مرزا راقم کو انٹرویو دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> "ایک بار راشد اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ہمراہ امریکہ سے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے یہاں ساہیوال آئے۔ یہاں سے ہم سب ایک ویگن کرائے پر لے کر پاکپتن شریف گئے۔ وہاں راشد نے زردے کی ایک دیگ چڑھائی اور غربا میں خود تقسیم کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے مزار پر قرآن خوانی بھی کی۔" (غیر مطبوعہ)

یہ واقعہ تو پچاس کی دہائی میں ہوا ہوگا۔ اس سے بہت پہلے بچپن میں بھی ایسے شواہد ملتے ہیں جو راشد کی صوفیا سے عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً "قوسِ قزح"۔ لاہور میں اشاعت پذیر ہونے والی ان کی متعدد تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے والد کی طرح اپنے نام کے ساتھ "چشتی" لکھا کرتے تھے۔ بعد میں نام کا یہ "لاحقہ" تو اڑ گیا مگر ارادت وعقیدت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ راشد نے باقاعدہ بیعت بھی کی تھی، مگر ان کے عزیزوں کے بیانات اور بعض خطوط کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ راولپنڈی کے ایک بزرگ سید ہاشم حسین شاہ صاحب سے عقیدت رکھتے تھے۔ پروفیسر غلام محی الدین مرزا کے بقول راشد کے ہم زلف اور معروف ہمعصر شاعر مختار صدیقی بھی ان سے ارادت رکھتے تھے اور دونوں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ راشد کے دیرینہ دوست آغا عبدالحمید کے نام ان کے بعض خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی شاہ صاحب کے نیازمندوں میں شامل تھے۔ کم سے کم اتنا ضرور تھا کہ آغا عبدالحمید راشد کی عقیدت وارادت سے بخوبی آگاہ تھے۔ راشد، شاہ صاحب سے اپنے دنیاوی اور معاشی مسائل میں بھی راہنمائی حاصل کیا کرتے تھے اور ان کے ذریعے سے مالی طور پر خدمت دین کی سعادت بھی حاصل کیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری برسوں تک جاری رہا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شیلا راشد ان کے عقیدہ و مذہب سے متعلق میلانات میں حائل نہیں تھیں اور انھوں نے حسین شاہد کو انٹرویو دیتے ہوئے راشد کو جو "مسلمان اور محض مسلمان" کہا ہے، مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ بہر حال راشد کی شاہ صاحب سے ارادت وعقیدت دورِ آخر تک رہی۔ آغا عبدالحمید کے نام ۲ مئی ۱۹۷۱ء کو تہران سے لکھے گئے خط میں رقمطراز ہیں:

> "پاکستان میں بشیر اور مختار صدیقی سے لاہور میں ملاقاتیں ہوئیں اور شاہ صاحب سے راولپنڈی میں۔ شاہ

Scanned by CamScanner

صاحب جو مسجد بنوا رہے تھے وہ مکمل ہو گئی، جس دن ہم راولپنڈی پہنچے اس پر چھت ڈالی جا رہی تھی...... مجھے اب نومبر میں ریٹائر ہو جانا ہے...... شاہ صاحب کا خیال ہے کہ مجھے سال بھر اور تہران میں رہنا چاہیے۔ اگر نومبر ۱۹۷۲ء تک توسیع مل جائے تو مزید کئی مشکلات حل ہو جائیں گی۔'' (۹)

راشد کے کئی اور خطوں میں بھی شاہ صاحب کا ذکر ملتا ہے۔ ان سے عقیدت و ارادت کے باوجود راشد اپنے مزاج کے مطابق کبھی کبھی تشکیک و تذبذب میں بھی مبتلا ہو جایا کرتے تھے۔ اس تشکیک کا آئینہ دار ان کا ایک خط دیکھا جا سکتا ہے جو ۱۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کو انھوں نے تہران سے فخر محمد ماجد کے نام لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

''صحیح بات یہ ہے کہ شاہ صاحب ہوں یا کوئی اور، ان کی پیش گوئیوں پر اعتماد کر کے بیٹھے رہنا مجھے کبھی گوارا نہیں ہوا۔ اس لیے تم نے اچھا کیا کہ خود اپنے مستقبل کے بارے میں وہی فیصلہ کیا جس سے تمھیں اطمینان ہوا۔ شاہ صاحب آج کل غالباً عراق سے بھی آگے سعودی عرب وغیرہ کا سفر کر رہے ہوں گے۔ ستمبر کے آخر میں تہران لوٹیں گے۔ اگر چہ ان کا ارادہ حج تک سعودی عرب میں رکنے کا بھی تھا۔'' (غیر مطبوعہ)

غالباً یہ ملائیت کا اثر ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگوں کے ذہنوں میں نیکی اور عبادت کا تصور محض صوم وصلوٰۃ تک محدود ہے۔ مالی عبادت کو عبادت سمجھنے کا رجحان بہت کم ہے۔ حالانکہ اس کی افادیت صرف روحانی اور انفرادی نہیں بلکہ مادی اور معاشرتی بھی ہے۔ راشد کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو اسی سے متعلق ہے۔ وہ فراخ دل اور کشادہ دست تھے۔ وہ اپنی ذات پر ہی نہیں، دوسروں پر خرچ کرتے ہوئے بھی بالکل نہیں گھبراتے تھے۔ ان کی بیٹی یاسمین راقم کو ارسال کردہ تحریر میں لکھتی ہیں:

''پیسوں کے معاملے میں بہت بڑے دل کے مالک تھے۔ خاندان میں اگر کبھی بھی کسی کی ضرورت کا انھیں علم ہوتا، فوراً پیسے بھیجتے۔'' (غیر مطبوعہ)

اسی طرح شہریار راشد نے بھی راقم کے سوالنامے کے تحریری جواب میں یہی لکھا ہے:

"His great sense of responsiblity also stretched to his own family. I know, for instance, that he lent a helping hand to his brother and sisters whenever they needed assistance." (Unpublished)

راشد کی بہن ممتاز جہاں نے بھی اس ضمن میں اپنے انٹرویو میں اشارہ کیا ہے۔ ان کے بقول بھی راشد ''غریب رشتہ داروں کی خفیہ مدد کیا کرتے تھے۔''

خطوطِ راشد کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کی خالص مدد کرنے کے ساتھ ساتھ بوقت ضرورت انھیں قرض بھی دے دیا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ بیرونِ ملک سے آتے ہوئے تحائف بھی لے کر آیا کرتے تھے اور کبھی کبھی فرمائشیں بھی پوری کر دیا کرتے تھے۔ ان سب باتوں میں وہ کشادہ دستی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ بیرون ملک جانے سے پیشتر راشد نے اپنے بعض عزیزوں کو اپنے پاس ٹھہرایا اور حصولِ علم میں ان کی مدد کی۔ اس ضمن میں ان کے پھوپھی زاد بھائی عبدالحفیظ نے راقم کے سوالنامے کے تحریری جواب میں لکھا ہے:

''میں یعنی آپ کا پھوپھی زاد بھائی کافی عرصہ آپ کے زیر سایہ رہا۔ ملتان میں جب آپ کمشنر کے دفتر میں ملازم تھے تو میں آپ کے ہاں ہی رہائش پذیر تھا۔ مجھے انھوں نے ایف۔ اے کا پرائیویٹ امتحان دینے پر آمادہ کیا۔ پھر جب آپ دہلی میں تھے تو آپ کے ایک خالہ زاد جمیل ارشد کیلانی (محمد جمیل کیلانی کے صاحبزادے) نے آپ کے پاس رہ کر گریجویشن کیا۔'' (غیر مطبوعہ)

راشد کی کشادہ دستی محض رشتہ داروں ہی کے لیے نہ تھی بلکہ اس کے دائرے میں جان پہچان رکھنے والے وہ لوگ بھی

Scanned by CamScanner

آ جاتے تھے جنھیں ان کی نگاہ ضرورت مند کے طور پر دیکھتی تھی۔ اے حمید لکھتے ہیں:

''ایک بار راشد صاحب مستی گیٹ لاہور کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھے۔ میں ٹی ہاؤس میں سے اٹھ کر ان سے ملنے مستی گیٹ گیا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ مجھے ان سے کام کیا تھا۔ مجھے ملے اور جب میں واپس جانے لگا تو قریب آ کر پوچھا ''پہلوان پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔ میرے پاس اس وقت ہیں۔'' (۱۰)

غریبوں، حاجتمندوں اور مصیبت زدوں کے لیے راشد خاصے مخیر تھے۔ اس باب میں انھوں نے کبھی خست نہیں کی۔ غلام محی الدین مرزا نے راقم کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا

''راشد خیرات دیا کرتے تھے اور غرباء کی مدد کرنا ان کا شیوہ تھا۔ بنگال میں شاید ایک بار سیلاب نے تباہی مچا رکھی تھی۔ انھوں نے وہاں چار پانچ ہزار امریکن ڈالر بھجوائے۔'' (غیر مطبوعہ)

متذکرہ بالا واقعات سے دوسروں پر خرچ کرنے کے سلسلے میں راشد کی شخصیت میں پائی جانے والی فراخ دلی کا بخوبی اظہار ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان اور انسانیت کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔

راشد کی مذہبی زندگی کا سب سے اہم اور معتبر حوالہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد میں جائیداد کی تقسیم خود اپنے ہاتھوں شرعی انداز سے کی۔ اس کے بارے میں اپنی زندگی کے آخری دن یعنی ۹۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو چیلٹنہم (انگلینڈ) سے لکھے ہوئے دو خطوں میں کسی قدر تفصیل فراہم کی ہے۔ فخر محمد ماجد کو لکھتے ہیں:

''جو کچھ یو۔ این سے ملا تھا بچوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ نسرین کو لاہور کا مکان دے رہا ہوں بلکہ دے دیا ہے۔'' (غیر مطبوعہ)

اسی طرح اپنے دیرینہ دوست خواجہ کریم بخش کے نام رقم طراز ہیں:

'' سب بچوں کو ان کا حصہ شرعی انداز سے ادا کر دیا ہے۔ نسرین کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ مکان کی قیمت جو آپ نے بتائی ہے وہ ہر بچے کے حصے سے زیادہ ہے ..... اگر کبھی پاکستان آیا تو قانونی طور پر مکان اس کے حوالے کر دوں گا۔'' (غیر مطبوعہ)

راشد کو خود تو پاکستان آنے کی مہلت نہ مل سکی لیکن بعد میں قانونی طور پر نسرین راشد کو لاہور والا مکان مل گیا۔ واضح ہو کہ راشد نے شرعی طور پر حاصل اپنا خصوصی اختیار استعمال کرتے ہوئے بڑی بیٹی نسرین کو نسبتاً زیادہ حصہ دیا۔ اس کا سبب ان کی سعادت مندی نہیں بلکہ زندگی کی محرومیاں تھیں جن کے باعث وہ راشد سے ناخوش تھیں۔ یہاں شیلا راشد کے ایک خط کا اقتباس درج کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے چیلٹنہم، (انگلینڈ) سے ۲۔ فروری ۱۹۷۶ء کو فخر محمد ماجد کے نام لکھا:

Nasrin continues to worry about her inheritance. I have sent all the deeds concerning the Samanabad house to Shahri and have asked him to see that the house is made over to her. Also Nazri's savings with the National and Grindlays should be divided up between the 5 children. Nazeil and I claim no share in Nazri's estate in Pakistan. He saw to it that my future was taken care of." (Unpublished)

رقم کی تفصیل کے بارے میں ساقی فاروقی نے بھی ''حسن کوزہ گر'' میں کسی قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

''میں نے سنا ہے، انھوں نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے شہریار کو ڈیڑھ لاکھ روپے اور اپنی ہر بیٹی کو ۷۵ ہزار روپے بھجوا دیے تھے۔ سوائے ایک بیٹی کے جنھیں وہ اپنا لاہور والا مکان دینا چاہتے تھے۔ شیلا کہتی ہیں کہ کاغذات کی منتقلی عنقریب مکمل ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ان کی لائف انشورنس سے پہلی بیوی کے تمام

Scanned by CamScanner

بچوں کو ۳۰، ۳۰، یا ۴۰، ۴۰ ہزار روپے مل جائیں گے۔" (۱۱)
جائیداد کی تقسیم کا ایک ایسا مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر بڑے بڑے متشرع اور متدین لوگ بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ مگر راشد نے حتی الوسع انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ جس بیٹی کو انھوں نے کچھ زیادہ دیا، سب بچوں کی رضامندی سے دیا۔ راقم کے استفسار کے جواب میں شیلا راشد نے ان کی انصاف پسندی کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

Mr. Rashed had drawn up a settlement fo his five children according to Islamic Law. This was agreed to and signed by all five. Mr. Rashed was a very fair and just husband. His personal belongings and property had been carefully distributed fairly amongst his children and I was financially taken care of. He was a most orderly and organised person and no problems whatsoever arose after his death." (Unpublished)

جہاں تک دوسری بیوی اور اس کے بچے نزیل راشد کا تعلق ہے، راشد کو ان کے سلسلے میں ملکی قوانین کی پابندی کرنا تھی۔ بہر حال جہاں تک ممکن تھا، راشد نے جائیداد کی تقسیم شریعت کے اصول وضوابط کو ملحوظ رکھ کر کی۔

مندرجہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ راشد جائیداد کی تقسیم جیسے اہم معاملے میں بہت بہتر مسلمان ثابت ہوئے۔ اگرچہ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند نہ تھے مگر عقیدے کے اعتبار سے، عام مسلمانوں سے بہتر نہیں تو بدتر بھی نہ تھے۔ کفر والحاد کے خیالات ان کے ذہن میں تشکیک وتذبذب پیدا کرتے رہے اور وہ کشمکش کا شکار بھی ہوتے رہے مگر مذہب ان کے احاطۂ خیال سے نکل نہ سکا۔ وہ عام انسانوں کی طرح گناہگار انسان تھے اور انھیں پارسائی کا دعویٰ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ کفر والحاد کے فتوے صادر کرنا زیادتی ہے:

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حوالہ جات

۱۔ نیادور۔ کراچی: شمارہ ۷۱۔ ۷۲ ن م راشد نمبر، سن ندارد۔ ص ۳۹
۲۔ Annual of Urdu Studies. Chicago: 1985
۳۔ نیادور۔ کراچی: راشد نمبر۔ ص ۲۰۱۔ ۲۰۲
۴۔ "زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں" فنون۔ لاہور: جلد ۲۱۔ ۲۲، شمارہ ۶، نومبر دسمبر ۱۹۷۵ء۔ ص ۵۹
۵۔ "سجناں وی مر جانا" فنون۔ لاہور: شمارہ ۲، دور نو، اگست ستمبر ۱۹۷۶ء، ص ۶۰
۶۔ نقوش۔ لاہور: شمارہ ۱۳۴، دسمبر ۱۹۸۶ء۔ ص ۲۸۵۔ ۲۸۶
۷۔ ایضاً۔ ص ۲۸۷۔ ۲۸۸
۸۔ کلیات راشد۔ لاہور: ماورا پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۵۷۱۔ ۵۷۲
۹۔ نیادور۔ کراچی: راشد نمبر۔ ص ۱۸۲۔ ۱۸۳
۱۰۔ اے حمید۔ سنگ دوست۔ لاہور: جودت پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء۔ ص ۵۶۵
۱۱۔ نیادور۔ کراچی: راشد نمبر: ص ۳۳

Scanned by CamScanner